Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 4, Issue 3
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

ایاز علی جرح
لیکچرار، شہید بے نظیر بھٹو یونی ورسٹی، نواب شاہ
ڈاکٹر شذرہ حسین
ایسو سی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو

اردو ادب کی منتخب خواتین کی خاکہ نگاری کا جائزہ

Ayaz Ali Jarah
Lecturer, Shaheed Benazir Bhutto University, Nawabshah
Dr. Shazra Hussain
Associate Professor, Department of Urdu, University of Sindh, Jamshoro

A Critical Review Of Selected Female Sketches Writers Of Urdu Literature

In Urdu literature, sketching is a very popular and heartwarming genre like fiction. Sketch is also a separate genre like essay, fiction, drama, and story. Its religious symbols are also called (photo type, sketch). It is believed and recognized as gender, The art of sketching is both easy and difficult, language is also taken into account in sketching, is a very complex genre (which is consumed by sign language).When we mention sketching in Urdu literature, like other genres, there are very few creations of women in sketching. But the women who wrote sketches are of very high quality, but a question arises in the mind. Why hasn't physical examination been done in Khangari, and what is the reason for it, so many questions arise in the mind, is it the dominance of men over women in this society due to which women are being degraded, so maybe the rest of the castes Similarly, the tendency of women in sketching is less, famous sketchers of Urdu literature, who have written very good sketches, names of some of them are listed and comments are being made on the sketching of selected women. Saliha Abid Hussain, Hamida Akhtar Hussain Raipuri, Bano Qudsia and Razia Sajjad Zaheer are prominent among these women.

Key words. Language,sketch,mind,relax, meditation

خاکہ کے لغوی معنی ڈھانچہ بنانا ہے، مسودہ بنانا ہے جبکہ ادبی نقطہ نظر سے خاکہ شخصیت کی ہو بہو عکاسی ہے، محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ خاکہ نگاری ادب کی ایک صنف ہے جس میں شخصیتوں کی تصاویر اس طرح براہ راست کھینچی جاتی ہیں کہ ان کی ظاہر و باطن دونوں قاری کے ذہن میں اتر جائیں اور ایسا محسوس ہو جیسے پڑھنے والے نے صرف قلمی چہرہ دیکھا ہے بلکہ خود شخصیت کو بھی دیکھا ہے۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں خاکہ نگاری کی بڑی اور اولین شرط میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنا دے ، بڑے کو کتنا بھی بڑا بنا دے وہ آسان ہے لیکن چھوٹے کو بڑا بنانا فن اور فن کاری ہے

خاکہ نگاری کا فن آسان بھی اور مشکل بھی ہے، خاکہ نگاری میں زبان کا بہت خیال بھی رکھا جاتا ہے، خاکہ نگاری ایک بہت ہی پیچیدہ صنف ہے "جس کو اشاروں کی زبان کہا جاتا ہے" شمیم احمد لکھتے ہیں کہ خاکہ نگاری ایک ایسی صنف ہے جس میں قاری اپنے ذہن میں ظاہر و باطن عکس ذہن نشین کر کے نہ صرف اس نے چہرا دیکھا ہو بلکہ اس شخصیت کو سمجھا اور دیکھا بھی ہو۔

اردو ادب میں خاکہ نگاری کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا تھا لیکن اس کو ترقی بیسویں صدی میں ملی ہے اردو ادب میں جن لوگوں نے خاکہ نگاری کو روشناس کرایا ہے اان میں مولوی عبدالحق، مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی اور شاہد احمد کا نام سر فہرست ہے۔ مشرقی تصور زندگی پر مذہبی اقتدار کا پہرہ حاصل ہے، مشرقی خواتین مردوں کی نسبت کمزور اور لاغر سمجھی جاتی ہیں وہ اپنے حق کی بات بھی نہیں کر سکتی ہیں کیوں کہ شروع سے لے کر آخر تک مرد کو مقام حاصل ہوا ہے، حالی کی نظموں نے، نذیر احمد اور راشد الخیری کے ناولوں نے کچھ خواتین کو ہمت دی ہے کہ وہ اپنی اظہار رائے پیش کر سکیں، جن میں محمدی بیگم، اشرف جہاں، نظر سجاد حیدر نے اپنی تخلیقات کے زریعے اس تحریک کو وسعت دی، مسلم عورتوں میں سب سے پہلے جس نے ان روایات سے بغاوت کی اور عالمگیر نظریات کو سمجھا وہ ڈاکٹر رشید جہاں ہے۔ ان کے بعد قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید نے بغیر کسی تفریق کے ادب تخیق کیا ہے۔

جب ہم اردو ادب میں خاکہ نگاری کا ذکر کرتے ہیں تو باقی اصناف کی طرح خاکہ نگاری میں بھی خواتین کی تخلیقات بہت کم ہیں۔ مگر جن خواتین نے خاکے لکھے ہیں وہ بہت اعلی درجہ کے ہیں، مگر ذہن میں ایک سوال اٹھتا ہے آخر خواتین نے خاکہ نگاری میں طبع آزمائی کیوں نہیں کی ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے، بہت سارے سوالات ذہن میں جنم لیتے ہیں کیا اس معاشرے میں عورتوں پر مردوں کی بالا دستی ہے جس کی وجہ سے عورتیں پستی جارہی ہیں، اس لئے شاید باقی اصناف کی طرح خاکہ نگاری میں خواتین کا رجان کم ہے، اردو ادب کی مشہور خاکہ نگار جنھوں نے بہت اچھے خاکے تحریر کئے ہیں ان میں سے کچھ کے نام درج ذیل ہیں اور ان منتخب خواتین کی خاکا نگاری پر تبصرہ کیا جارہا ہے۔

ان خواتین میں صالحہ عابد حسین، حمیدہ اختر حسین رائے پوری، بانو قدسیہ اور رضیہ سجاد ظہیر کے نام سر فہرست ہیں۔

حمیدہ اختر حسین رائے پوری

حمیدہ اختر حسین رائے پوری پاکستان کی معروف شاعرہ اور مصنفہ ہیں اور ان کا شمار اردو ادب کی ممتاز ادیباؤں میں ہوتا ہے اختر حسین رائے پوری 22 نومبر 1918 کو ہردوئی میں پیدا ہوئی تھیں ان کے والد محترم اردو کے پہلے جاسوس ناول نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں اختر حسین رائے پوری اردو کے مشہور نقاد، محقق اور ترقی پسند تحریک کے محرک نمائندہ رہ چکے ہیں حمیدہ اختر حسین نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اپنے شوہر نامدار کی وفات کے بعد شروع کیا، اپنے شوہر کی وفات کے بعد آپ نے ان کی خود نوشت تحریر کی جو ہم سفر کے نام سے بہت مقبول ہوئی حمیدہ اختر حسین رائے پوری کے خاکوں کے دو مجموعے بہت مشہور ہیں جن میں سے ایک "نایاب ہیں ہم "اور دوسرہ" چہرے مہرے "ہیں، آپ نے بچوں کے لئے بہت ہی عمدہ معنی خیز کہانیاں لکھی ہیں اس کے علاوہ آپ کو اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے ادبی انعام بھی مل چکا ہے۔ حمیدہ اختر کا دوسرہ مجموعہ چہرے مہرے ہے۔ حمیدہ اختر نے اس مجموعے میں چار اشخاص کے خاکے لکھے ہیں "جس کا پہلا خاکہ ایک لڑکی کے بارے میں ہے جس کا نام صائمہ ہے حمیدہ اختر حسین نے صائمہ کے کردار کو بہت اچھے طریقے سے پیش کیا ہے۔ صائمہ کی کہانی تصوراتی ہے (1) لیکن اس کے سارے کردار سچے اور اصل ہیں اور اس کے ساتھ آنے والے مسائل بھی حقیقی ہیں۔ حمیدہ اختر حسین اس کتاب کے دیباچے میں لکھتی ہیں کہ وارث ہوتے بھی لاوارثوں کی طرح دوسرے ممالک میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے اور خوار ہو رہی ہے۔

"صائمہ ان لوگوں میں کیسے جان ڈالتی ہیں جس سے ان کا شمار پھر سے زندوں میں ہونے لگتا ہے (2)

صائمہ کا اصل نام ساجدہ بیگم تھا جب وہ صرف دو سال کی تھی تو ان کی والدہ انتقال کر گئی تھیں پھر صائمہ کی پرورش ان کی ایک پھوپھی نے کی تھی پھر کچھ سالوں میں ان کی پھوپھی کی شادی ہو گئی تھی تب صائمہ 6، 7 سال کی تھی، والد صاحب ملازمت کی وجہ سے اکثر باہر رہتے تھے، بیٹی اکیلی نہ ہو جائے دوسری شادی بھی کر لی حسب معمول سوتیلی ماں کے ظلم برداشت نہ کر سکی اور صائمہ نے اپنا گھر چھوڑ دیا پھر صائمہ کی زندگی میں دو ایسے لوگ آجاتے ہیں ،وہ ہیں بیگم صاحبہ اور ڈپٹی

صاحب۔اس کہانی میں صائمہ کے علاوہ اور بھی بہت سے کردار ہیں،بحر حال صائمہ کی شادی عدنان سے اس شرط پے ہو جاتی ہے کہ معاشرے کے لوگوں کی خدمت کرتی رہے گی اور اس کو کوئی روکے گا نہیں اور اس طرح اختر حسین رائے پوری نے اس خاکے کے زریعے صائمہ کے کردار کو بہت اچھے طریقے سے پیش کیا ہے

چہرے مہرے کا دوسرا خاکہ جمیل بھائی تھے،حمیدہ اختر حسین رائے پوری نے جمیل جالبی کا خاکہ جالبی کے عنوان سے لکھا ہے،اس خاکہ میں حمیدہ اختر حسین رائے نے جمیل جالبی کی شخصیت علم دوستی اور اختر حسین سے دلی لگاؤ کا ذکر بھی کیا ہے۔آپ لکھتی ہیں کہ "ان کی پہلی ملاقات جمیل جالبی سے 1954 میں ہوئی جمیل جالبی کے گھر میں ہونے والی آموں کی دعوت،ان کی بیگم کی سلیقہ مندی،بچوں کی فرمانبرداری اور انجمن سے دلی لگاؤ کا ذکر ملتا ہے آپ نے جمیل صاحب کا حلیہ کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے 6 فٹ کے قد سے اونچے تھے چلنے کا انداز بڑا خوبصورت تھا جب وہ قریب آئے تو بڑے غور سے دیکھا تو آنکھیں چمکیلی اور سمندر سے گہری،ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی جس کے ساتھ ادب و آداب کا عنصر نمایاں تھا(3)

حمیدہ اختر آگے لکھتی ہیں کہ جمیل بھائی پان کھانے کے بہت شوقین تھے،والدین نے نام جمیل رکھا تھا اور خود نے جالبی رکھا تھا،آپ انکم ٹیکس میں ملازم تھے،جب مجھے پتا چلا کہ جمیل بھائی انکم ٹیکس میں ملازم تھے تو میں حیرت زدہ ہو گئی کہ انکم ٹیکس اور ادب کا آپس میں دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا مصنفہ لکھتی ہیں کہ جمیل صاحب کو دعوت کرنے کا بہت شوق ہوتا تھا جب بھی کوئی مہمان پاکستان سے آئے، پاکستان سے باہر کا آتا تھا تو آپ سب سے پہلے ان کی دعوت کرتے تھے اور اس طرح سارے دوستوں کو اکٹھے کرتے تھے اور اپنی ماضی کی یادیں تازہ کرتے تھے،

''چہرے مہرے کا تیسرہ خاکہ پاشی تھا،خاکہ پاشی حمیرہ اختر حسین رائے پوری کا خوبیوں کا مجموعہ ہے انہوں نے اس خاکے میں یہ بھی بتایا ہے کہ مولوی عبدالحق،پاشی کے والد کے دوست بھی تھے اور آپ نے کاشی کا نکاح بھی پڑھایا تھا لیکن پھر بھی پاشی کے خیالات مولوی عبدالحق کے بارے میں اچھے نہیں تھے۔پاشی زہرہ باجی کی والدہ تھی جس کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کے بچے،بجیا،ثریا،احمد مقصود،انور مقصود اور زہرہ نگار تھے،پاشی کو مذہبی علم پر دسترس حاصل تھی وہ بلکل فطرت قوانین اور دین کے اصولوں کے بارے میں علم رکھتی تھی،دستکاری کے فن پر آپ کو عبور حاصل تھا۔اللہ پاک نے آپ کو بڑی عجیب و غریب نعمتوں سے نوازا تھا جب وہ ردی کاغذ کے ٹکڑوں کو ہاتھ لگاتی تھیں تو ایسا لگتا تھا جیسے ان میں جان آگئی ہو پاشی پھولوں سے بہت زیادہ پیار کرتی تھی وہ پھولوں کے ساتھ ایسی باتیں کرتی تھیں جیسے کوئی اپنے بچوں سے کرتا ہو اس لئے ان کے پودے دوسرے پودوں سے مختلف ہوتے تھے۔اس مجموعے کا آخری خاکہ علی گڑھ کی مشہور ڈاکٹر مس نیوس ہے اس عنوان سے یہ خاکا لکھا گیا ہے مصنف لکھتی ہیں کہ ''ڈاکٹر نیوس کو کون نہیں جانتا ہے جو اپنی جوانی میں 1902 میں یورپ کو چھوڑ کر علی گڑھ جیسے پسماندہ شہر میں آبسی،مصنفہ لکھتی ہیں کہ علی گڑھ میں وہ اپنے محبوب کے لئے آئی تھی پھر ساری عمر ہندوستان میں رہی،پھر محبوب کی بیوی کا علاج بھی کیا۔اس کے بیٹے کی پرورش اپنے بیٹے جیسے کی وہ بھی اپنے باپ کی طرح بے وفا نکلا،پھر پاکستان آکر اسپتال میں کام کیا اور ایک چوکیدار سے نکاح کر کے مسلمان ہو گئی۔مصنفہ لکھتی ہیں کہ ہر انسان کو مختلف قسم کے شوق بھی ہوتے ہیں(4)ڈاکٹر نیوس کو پودے لگانے کا بہت شوق تھا وہ اپنے پودوں کا بہت خیال رکھتی تھی۔وہ بڑی رحم دل اور انسان دوست شخصیت تھی اس لئے اپنے گھر کے کچھ کمرے اپنے مریضوں کے لئے وقف کر دیئے تھے ان کے ہاتھ میں بہت شفا ہوتی تھی بولنے میں بڑی مٹھاس ہوتی تھی اواپنی اس ادا کی وجہ سے علی گڑھ میں بہت مشہور تھیں۔

صالحہ عابد حسین

صالحہ عابد حسین اردو ادب کی مشہور نثر نگار تھیں آپ نے اردو ادب میں ہر صنف پر طبع آزمائی کی اور شہرت حاصل کی ہے آپ نے جتنے بھی خاکے لکھے ہیں وہ سب کے سب شخصی خاکے ہیں آپ کے خاکوں کا مجموعہ "جانے والوں کی یاد آتی ہے" جس میں سترہ خاکے ہیں یہ خاکے ان لوگوں کے ہیں جن سے صالحہ عابد کو بہت محبت اور عقیدت تھی،کچھ کو تو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور کچھ لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کی اور خاکہ لکھ ڈالا اس مجموعے میں جن لوگوں کے نام ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں،الطاف حسین حالی،خواجہ سجاد حسین،مہاتما گاندھی،اسلم جیرہ جپوری،ڈاکٹر ذاکر حسین،غلام محمد صادق،،شفیق الرحمن قدوائی اور صدیقہ قدوائی،قدسیہ بیگم،شبیر حسن زیدی،محترم مشتاق فاطمہ،عزیز سیدین،خواجہ اظہر عباس،مختیار مہدی،سید اصغر وائی پوری اور خواجہ غالم سیدالدین کے نام سر فہرست ہیں۔مصنفہ نے اپنی اس کتاب میں ہر شخصیت کو بڑے احترام اور محبت سے لکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ ان کے ہر پہلو کو اجاگر کیا جائے۔اس کتاب کا پہلا خاکا الطاف حسین حالی کے بارے میں ہے حالاں کہ صالحہ عابد حسین نے حالی کو کبھی دیکھا تک نہیں تھا مصنفہ لکھتی ہیں کہ ''یہ کتاب

میرے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو میں اپنے بزرگوں اور پیاروں کی یاد میں لکھا ہے، یہ مضامین آگے چل کر فن پارے بن سکیں گے یا نہیں یہ میں نہیں جانتی باقی ان مضامین کو لکھنے سے میرے دل کو ٹھنڈک ضرور پہنچی ہے (5)

صالحہ عابد حسین حالی کی نواسی تھی "مولانا کی شخصیت کیا تھی کون نہیں جانتا تھا ان کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا ایک کھلی کتاب کی طرح تھا اس لئے اس مجموعہ کا پہلا خاکہ بھی الطاف حسین حالی ہے، اس خاکہ میں حالی کے ساتھ ساتھ حالی کے ہم عصر لوگوں کا بھی ذکر ہے مصنفہ لکھتی ہیں (جب میں پیدا ہوئی تو حالی صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے لیکن گھر کا ہر فرد ان کا ذکر اس شدومد کے ساتھ کرتا تھا کہ ہر آنکھ نم ہو جاتی تھی اس لئے بچپن سے مجھے حالی سے محبت ہو گئی تھی (6) اور میں نے حالی کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کتاب کا دوسرہ خاکہ حالی کے چھوٹے بھائی خواجہ سجاد حسین ہیں گھر میں سب ان کو اباجی کہہ کر بلاتے تھے آپ نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ نوکری میں گزارا ہے آپ پنجاب اور سرحد میں تعلیمات کے انسپیکٹر رہ چکے ہیں آپ نے 50 سال تک زندگی پائی، تقسیمِ ہند کی وجہ سے زیادہ معلومات حاصل نہیں کر سکی ، آگے "وہ ان کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ خواجہ سجاد حسین گھر کے ہر فرد کے ساتھ ان کی عمر اور مزاج کو دیکھ کر بات کرتے تھے وہ بہت خوش مزاج اور زندہ دل انسان تھے "(7)

اس سوانحی خاکہ میں صالحہ عابد حسین خواجہ سجاد حسین کے بارے میں لکھتی ہیں

"اباجی کی ہدایت و نگرانی میں خواجہ غلام سبطین اور نواسوں نے زہرہ ٹاؤن گرلس اسکول قائم کیا اس میں صاحب حیثیت لڑکیاں کم آتی تھیں وہ زیادہ حالی مسلم گرلس کالج میں جاتی تھیں جس کو قائم تو اباجی نے کیا تھا مگر بعد میں دوسرے صاحبان اقتدار کے سپرد کر دیا گیا تھا۔(8)

اس کتاب کا تیسرہ خاکہ مہاتما گاندھی کے بارے میں ہے۔ صالحہ عابد حسین نے مہاتما گاندھی کا خاکہ (امٹ یادیں) کے عنوان سے لکھا ہے وہ لکھتی ہیں کہ جامیہ اسلامیہ کا قیام گاندھی جی نے اپنے یاتھ سے کیا تھا۔ پورا خاکہ جامعیہ اسلامیہ کے بارے میں ہے مصنفہ لکھتی ہیں "جب 1920 میں ترکوں کی تحریک زوروں پر تھی اور ملک میں حصول آزادی کا جذبہ شدت اختیار کر چکا تھا اس زمانے میں مسلم علی گڑھ کو انگریزوں کی طرف سے امداد ملتی تھی۔ گاندھی جی کوشش تھی کہ علی گڑھ یونی ورسٹی کے ارباب اختیار کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ انگریزوں سے امداد نہ لیں مگر یونی ورسٹی سے سرفروشوں کی ایک جماعت نکل آئی جس نے انگریز حکومت کے اختلاف سے آزاد ایک ادارے کی بنیاد ڈالی جس کا نام جامعہ اسلامیہ رکھا گیا، گاندھی جامعہ کو اپنا گھر کہتا تھا جامعہ والوں کو اپنے گھر کے افرد کی طرح سمجھتے تھے اور اس ادرے کو ہندو و مسلم اتحاد کا مرکز مانتے تھے (8)، اس خاکہ میں مصنف نے گاندھی کی مقبولیت کی تصویر پیش کی ہے وہ جہاں بھی جاتے تھے لوگ بڑا پیار دیتے تھے۔

صالحہ عابد حسین نے مولانا اسلم جیرہ پوری کے بارے میں بھی ایک خاکہ لکھا ہے یہ خاکہ ویسے تو بہت مختصر لکھا ہوا ہے لیکن پھر بھی مصنفہ نے لفظ بہ لفظ پورے جذبے کے ساتھ لکھا ہے، مولانا صاحب اعظم گڑھ میں مقیم تھے ان کو تصنیف وتالیف پر عبور حاصل تھا "آپ میں وہ ساری خوبیاں تھیں جو ایک عظیم شاعر، نقاد اور ادیب میں ہوتی ہیں وہ جامعہ کے اہم رکن تھے ("9) مصنفہ لکھتی ہیں کہ میں 1947 میں نے برقعہ پہننا چھوڑ دیا تھا اور جب بھی مولانا سے ملاقات ہوتی تھی تو گھبرا جاتی تھی کہ مولانا میرے بارے کیا سوچیں گے لیکن وہ میرا وہم تھا "مولانا بہت ہی شفیق اور ہمدرد انسان تھے میری گھبراہٹ دیکھ کر سلام بھی وہ ہی کرتے تھے "10)

"اس اقتباس سے مولانا کی زندہ دلی اور اعلیٰ سوچ کا پتا چلتا ہے مولانا صاحب ایسی شخصیت تھے جو ایک مرتبہ مل جاتا تھا وہ کسی اور سے ملنے کی طلب نہیں کرتا تھا وہ بڑے خوش مزاج تھے خود بھی فقرے کہتے تھے اور دوسروں کے فقروں سے بھی بڑے لطف اندوز ہوتے تھے۔ (11)

صالحہ عابد حسین نے اپنی کتاب جانے والوں کی یاد آتی ہے میں مولانا عبدالکلام آزاد کا خاکہ (میرے مولانا کے نام سے لکھا ہے) وہ لکھتی ہیں کہ مولانا صاحب ایک عبقری شخصیت ہیں جس کا بیان صفحات میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے، علمی اداروں سے ان کو بہت لگاؤ تھا خاص طور پر علی گڑھ یونی ورسٹی سے، مولانا ایک نثر نگار بلند پایہ خطیب بے شمار خوبیوں کے مالک اور ایک ایڈیٹر بھی تھے۔ مصنفہ لکھتی ہیں "میری مولانا سے ملاقات 1946 میں اس وقت ہوئی جب وہ آصف علی خان کے پاس مقیم تھے میں نے پہلی بار ان کو دیکھا تھا وہ تفرق میں غرق اور ایک سمندر رتھے۔" (12)

اس طرح تھوڑی بہت ملاقات مولانا سے ہو گئی، 1947 میں جب ہندستان میں فسادات کی آگ لگی آپ نے حالی کے خاندان کی بہت مدد کی۔ پروفیسر ساجدہ زیدی جو صالحہ عابد حسین کی بھانجی تھی انہوں نے بھی اپنی سوانح عمری (نوائے زندگی) میں ان واقعات کا ذکر کیا ہے وہ (لکھتی ہیں "تقسیم فسادات کے دوراں جب میرے چھوٹے بھائی اور بھانجیوں کے گھر لٹ گئے اور پڑوسی سردار کی مدد سے ان کی جانیں بچیں تو مولانا کو کسی طرح یہ اطلاع دی گئی تو آپ نے فوجی ٹرک بھیج کر ان سب کو اپنے گھر بلا لیا۔ اس طرح ہم سب کی جانیں بچ گئیں" (13)

صالحہ عابد حسین نے اپنی بھابھی کا خاکہ عزیز سیدین کے نام سے لکھا ہے صالحہ عابد حسین کو اپنی بھابھی بڑی پیاری تھی وہ ان سے بے شمار پیار و عقیدت رکھتی تھیں آپ نے اپنی اس کتاب میں کم و بیش 30 صفحات پر اپنی بھابھی کے بارے میں لکھا ہے اس سے آپ خود اندازہ کریں کہ وہ اپنی بھابھی سے کس حد تک پیار کرتی تھی مگر وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکی کیوں کہ وہ اولاد سے محروم بھی تھیں اور ان کے بعد ان کے بھائی کی بھی وفات ہو گئی تھی ان خاکوں میں ان کے بھائی اختر کا بھی ذکر ہے جس سے ان کی محبتوں اور عقیدتوں کا ایک طویل سلسلہ ہے ۔ صالحہ عابد حسین کی کتاب کا ایک اور خاکہ مختیار مہدی کا خاکہ (چراغ شہر واماں) کے عنوان سے لکھا گیا ہے چناچہ دونوں خاکے صالحہ عابد حسین نے بڑے دردمندانہ انداز میں لکھے ہیں وہ لکھتی ہیں

"مختیار میاں تم تو سدھار گئے ہم سب چاہنے والوں کو چھوڑ کر چلے گئے میرا تمہارا کیا رشتہ تھا خون کا رشتہ بھی نہ تھا میں نے تم کو پالا بھی نہ تھا نہ ہی گود لیا تھا میری اور تمھاری عمر میں ماں اور بیٹے جیسا فرق تھا اس کو دوستی بھی تو نہیں کہہ سکتے تھے 14"

صالحہ عابد حسین کے مجموعہ جانے والوں کی یاد آتی ہے کا آخری خاکا سیدین میرے بھائی کے متعلق ہے۔ مصنف نے اپنے بھائی کا ذکر ہر جگہ کیا ہے ان کی خود نوشت کو ان کے مرنے کے بعد پورا کیا۔ غلام السیدین اور صالحہ عابد حسین میں بھائی اور بہن کا ایسا رشتہ تھا کہ آپ نے غلام السیدین کو اپنے خاندان کا سب سے مایہ ناز شخصیت قرار دیا ہے، آپ نے اپنی زندگی میں بہت دکھ دیکھے ہیں ،بیوی کی جدائی، صابرہ زیدی کی موت، اپنے بھائی اظہر عباس کی موت ان کے تمام صدمات نے ان کو توڑ کر رکھ دیا ہے جب ان کی وفات ہوئی تو دلی کا بچہ بچہ بھی رو رہا تھا وہ ایک عظیم انسان تھے۔

"جانے والوں کی یاد آتی ہے" مصنفہ نے عام بول چال کی زبان اور سادی اسلوب میں شخصیات کا ذکر کیا ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر

اردو ادب کی مشہور نثر نگار، خاکہ نگار افسانہ نگار رضیہ سجاد ظہیر کون نہیں جانتا وہ اردو ادب کی فلک پر ایک چمکتا ستارا ہے وہ صبح کی پہلی کرن جیسی ہے ان کی تحریر جس کو پڑھ کر ہر ادیب، مصنف، نثر نگار اپنے دن کی شروعات کرتا ہے۔ رضیہ سجاد ظھصر افسانہ نگار اور خاکہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں جو شہرت ان کو خاکہ نگاری میں ملی وہ شاید کسی اور خاکہ نگار کو ملی ہو آپ کا ایک خاکوں کا مجموعہ "زرد گلاب" ہے جس میں افسانے کی دلکشی اور تاثر دکھائی دیتا ہے سجاد ظہیر کا ایک خاکہ لنگڑی ممانی کا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ اس خاکہ میں ایک غریب لڑکی اور اس کے ساتھ پیش انے والے مشکلات کو بڑے خوب صورت انداز سے پیش کیا گیا ہے جس میں دوسروں کے لئے خودداری ہمدردی اور محبت کے جذبات اور دوسروں کے لئے قربانی پیش کرنے کا انداز پیش کیا گیا ہے بظاہر یہ ایک کہانی لگتی ہے لیکن رظیہ سجاد ظہیر نے اس میں جان ڈال دی ہے اور وہ کردار جیتا جاگتا نظر آرہا ہے۔

"تیرہ برس کی ایک کم سن دلہن کے نکاح کی اور شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں لیکن دولہا ایک حادثے میں مر جاتا ہے دولہے کا ایک پاؤں گھوڑے کی رقاب میں پھنس جاتا ہے اور گر جاتا ہے اور گرتے ہی اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے شادی والا گھر 10 منٹ میں ماتم خانہ بن جاتا ہے جتنے منہ اتنی باتیں ہو ری ہیں "(15)

اس خاکے میں لنگڑی ممانی کی زندگی کو مختلف عوامل کو پیش کیا رہا ہے جو نہ صرف انفرادیت کا احساس دلا رہی ہے بلکہ سماج کی خامیوں کو دور کرنے کا سلیقہ بھی عطا کرتی ہیں۔ خاکہ میں اس کی شخصیت اور جسمانی حسن کو اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

"بڑھاپے میں بھی اس کا رنگ ایسا تھا جیسے چندن دھوپ میں بیٹھے تو گلابی ہو جاتا ہے اور پان کھالیں تو گلے میں سرخی سی جھلکتی نظر آتی ہے، قد چھوٹا سا نہ تھا بہت ہی دبلا پتلا اور نازک جسم چوڑی دار پاجاما پہنتی تھیں موٹی ململ کا دوپٹہ جو اکثر سر پر ہوتا تھا " (16)

بس یہ ہی اس کا انداز تھا کہ ہر کوئی اس سے متاثر دکھائی دیتا ہے بڑے ہوں یا چھوٹے سب کے ساتھ بڑے پیار، محبت اور عقیدت سے پیش آتی تھیں بچوں کو قرآن اور دینی علم دیتی تھیں او سبق آموز باتیں سکھاتی تھیں اور پڑوسیوں کے خیر خوشی اور دکھ درد میں شرکت کرتی تھیں۔ مصنفہ آگے لکھتی ہیں:

"وہ دنیا بھر کی سلائی کرتی تھی مگر رمضان میں وہ محلے کی بیواہوں اور یتموں کے کپڑے سیتی تھیں ("17)

اس خاکہ میں "وہ لڑکی لنگری ممانی کے نام سے کیوں مشہور ہوئی، قصہ کچھ اس طرح تھا ایک لڑکا جو اس کو بہت پسند کرتا تھا لیکن وہ شادی کے لئے راضی نہیں تھی موقعہ پا کر اس نے لنگڑی ممانی کو اغوا کرنے کی کوشش کی لیکن ہر طرف سے لاٹھی چلی اور ایک لاٹھی لننگڑی ممانی کی ٹانگ میں اتنے زور سے لگی کہ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی بدقسمتی سے وہ ٹانگ پھر ٹھیک نہیں ہوئی("18)لوگوں نے لننگری ممانی کو سہارہ دیا بس دن وہ ایسے ہی گزارا کرتی تھی اچانک سے ایک دن محلے میں بلکل سناٹا ہو گیا تھا معلوم ہوا لنگڑی ممانی کا انتقال ہو گیا ہے بس محلے کے ہر طرف سے ایک آواز آرہی تھی ایک ہمدرد اٹھ گیا ہے جو سب کا ہمدرد، خیر خواہ اور غم خوار تھا مصنفہ نے اپنے اس خاکہ کو بہت ہی عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے اایسا لگتا ہے مصنفہ کا اس خاکہ سے دلی لگاؤ بھی تھا

رضیہ سجاد ظہیر کے مجموعہ کا دوسرہ خاکہ "ستون کے عنوان" سے ہے جو اس کے اپنے باورچی کے بارے میں جس کا نام امیر خان تھا، وہ اپنے باورچی کے بارے میں لکھتی ہیں

"میرا باورچی میرا خدمت گار، سیکیریٹری، مشیر غم خوار اور میرا بزرگ مطلب سب کچھ تھا وہ بہت غریب اور معصوم تھا پھر نہ جانے زندگی کی ستم گری نے ان کا نام امیر خان کیسے رکھ دیا(19)

وہ اپنے باورچی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

گھر میں ہر چیز کی موجودگی کے ہوتے ہوئے بھی وہ دکاندار سے ادھار لے کر آتا تھا جس کے پیسے مجھے دینے پڑتے تھے کیوں کہ وہ ادھار اپنے لئے نہیں لیتا تھا بلکہ وہ ادھار غریبوں اور مسکینوں کے لئے لیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ایک غریب لڑکے کو اپنی کوٹھری میں ٹھہرایا جو اس کی چوری کر کے بھاگ گیا تھا، کچھ دنوں کے بعد میں دیکھا ایک عورت بھی اس کی کوٹھری میں رہتی ہے جس کی وہ بزرگوں کی طرح رہنمائی کرتا تھا۔ ایک دن رضیہ سجاد ظہیر نے وامق صاحب کی دعوت کی اور وہ باورچی کو بتانا بھول گئی لیکن باورچی نے سارے انتظامات خود ہی کر دیئے تھے وہ لکھتی ہیں کہ اگر اس مرتبہ انتظامات نہ ہوتے تو مجھے بڑی شرمساری ہوتی دراصل یہ خانسامہ خاکہ نگار کی ساری کمزوریوں سے بخوبی واقف تھا، انہیں احساسات اور اور محبت کی وجہ سے ان کی سب خامیوں کو نظر انداز کرتی تھیں اس طرح رضیہ سجا ظہیر نے اپنے خانسامہ کو ایک ستون کی طرح ثابت کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئی ہے۔ اور یہ بھی دکھایا ہے کہ ان کی زندگی کو جب بعض مواقع پر مایوسی اور بے چینی گھیر لیتی تھی تو اس کی ذات کتنا بڑا سہارا بن کر ہمت بڑھاتی تھی، ان چند سالوں میں ایک بار کسی صدمے سے بے قرار ہو کر میں چپ ہو جانے کہ بجائے رو رہی تھی کسی رشتے دار کا وہ طعنہ جو برداشت سے باہر تھا، رات کا وقت تھا سناٹے کا عالم تھا پھر مجھے بابا کے رونے کی مدھم سی آواز سنائی دی وہ بار بار میرے آگے گزر رہا تھا اور آخر میں اپنے ہاتھ میرے کندھے پر رکھ اور کہا کیا اپ واقعی رو رہی ہیں، ارے آپ تو بڑی کم ہمت نکلیں مجھے دیکھیں میں کتنے سال سے اکیلا رہا ہوں جن کی میں برسوں خدمت کی وہ چھوڑ کر انگلستان چلا گیا ہے میں کبھی نہیں رویا میرا کوئی نہیں ہے، میرے بڑھاپے کا کوئی آسرا نہی ہے، میں پھر بھی نہیں روتا ہوں مصنفہ لکھتی ہیں اس خانسامہ کی ان باتوں سے مجھے ہمت آجاتی ہے اور صبر اجاتا ہے اور واقعی میرا خانسامہ ایک ستون کی طرح ہے۔

سجاد ظہیر کا ایک اور خاکہ یاد کے عنوان سے ہے جو ایک یتیم بچے کے بارے میں ہے خاکہ میں ایک ایسے بچے کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے جو ملازم کی حیثیت سے کام کرتا تھا ایک مرتبہ وہ بچوں کے ساتھ سینیما دیکھنے گیا تھا اس میں اب یہ عادت پڑ گئی تھی۔ اس خاکہ میں خاکا نگار نے اپنے والدین کے گھر کا رہن سہن اور جاگیر دارانہ ماحول کی عکاسی نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کی ہے وہ لڑکا ایک سامان چرا کر بھاگ جاتا ہے اور پولیس اس وقت اس کو گرفتار کرتی ہے جب وہ سینما میں فلم دیکھتا ہے اس طرح خاکا نگار نے ایک غریب اور یتیم لڑکے کی نفسیات کا نقشہ کھینچا ہے کہ کس طرح اس کی فطرت میں بھی برتری اور بلندی حاصل کرنے کا احساس موجود ہے۔

بانو قدسیہ

25 نومبر 1928 کو اردو کی مشہور افسانہ نگار اور اردو ڈراما نگار محترمہ بانو قدسیہ کی تاریخ پیدائش ہے۔ 1950 میں آپ نے پنجاب یونی ورسٹی سے ماسٹرس کیا تھا، اور مشہور افسانہ نگار، ڈراما نگار اشفاق احمد سے رشتہ ازواج میں منسلک ہو گئیں۔ بعد ازاں شوہر کی مدیریت میں ادبی پرچہ داستان گو جاری کیا، بانو قدسیہ

کا شمار اہم افسانا نگاروں میں ہوتا ہے ان افسانوں مجموعوں میں نا قابل زکر بازگشت، امر بیل، اور کچھ نہیں کے نام شامل ہیں ان کا ناول راجہ گدھ ان کے اسلوب کی وجہ سے اردو کے اہم ناولوں میں شمار ہوتا ہے، جب کہ ان کے ناولٹس میں ایک دن، شہر بے مثال، پروا، موم کی کلیاں اور چہار چمن کے نام شامل ہیں انہوں نے ٹی وی کے لئے بھی بہت سارے ڈرامے لکھے ہیں، حکومت نے آپ کو ستارہ امتیاز سے بھی نوازا ہے۔

یہ خاکہ بانو قدسیہ کی مشہور کتاب مرد ابریشم کا ہے، مرد ابریشم کا مطلب ہے ریشم کی طرح نرم و ملائم، یہ کتاب اردو کے بہت بڑے مفکر، نثر نگار قدرت اللہ شہاب کے بارے میں لکھی گئی ہے۔" بانو قدسیہ اس کتاب میں تھوڑا سا اپنے خاندان کے بارے میں بات کرری ہیں "جب ان کے والد صاحب کی وفات ہو جاتی ہے تو لوگ بانو قدسیہ سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے ابا گزر گئے ہیں وہ کھتی ہیں کہ اس وقت گزر جانے کا مطلب مجھ نہیں آتا تھا" (20)

وہ لکھتی ہیں کہ "میری اماں بھی سوال نہیں پوچھتی تھیں بس ہمیشہ چپ رہتی تھیں کیوں کہ اس وقت امی کی عمر 27 سال تھی جب ابا گزر گئے اس وقت بھی کسی سے کوئی شکایت نہیں کی کہ اے اللہ مجھے تم نے اتنی جوانی کی عمر میں کس کے سہارے چھوڑ دیا ہے وہ بالکل صابر شاکر تھیں۔ بانو قدسیہ لکھتی ہیں "سن 37 میں جو سوال اپنے آبائی گھر کے متعلق اپنی امی سے پوچھے تو اس کا جواب مجھے قدرت اللہ شہاب سے ملا وہ بھی ان کے مرنے کے تیسرے دن کہ بعد("21)

شہاب صاحب کے بارے میں لکھنے کی ہمت نہیں تھی کیوں کہ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو بیج سے پودا، پودے سے درخت اور درخت سے تناور درخت بنا دیتے ہیں، ان کے متعلق کچھ لکھنا، درستگی، سچائی اور یقین کے ساتھ لکھنا بہت مشکل ہے۔ مجھے شہاب صاحب کو سمجھنے میں مجھے 30 سال لگ گئے اب مجھے کوئی الجھن نہیں ہے کیوں کہ یقین کامل نے میری زندگی کو آسان کر دیا ہے بانو قدسیہ لکھتی ہیں کہ "شہاب صاحب سے میری ملاقات میری شادی سے پہلے ہوئی تھی لیکن یہ ملاقات مجھ پر اثر انداز اس لئے ہوئی، میرا خیال تھا کہ میرا ہونے والا شوہر اپنی معتبری جتانے کے لئے اس بڑے افسر کو لے کر آئیں ہیں ہماری شادی کچھ ایسے حالات میں ہوئی تھی کہ اشفاق صاحب گھر سے نکالے گئے تھے ہم نے اپنی زندگی چھڑے چھانڈا کیلے سر شروع کی تھی"(۔22)

آگے وہ لکھتی ہیں کہ "جب میں شادی والا جوڑا پہن کر اشفاق کے سامنے ائی تو اشفاق کا منہ کڑوا ہو گیا تھا" وہ کہنے لگے عورتوں والے چونچلے چھوڑو۔ میری ساتھی بن جاؤ، کپڑوں کا سہارا نہ لو زیور کی تمنا نہ کرو۔ لکھو، محنت کرو، رات دن کام کرو پھر ایسی آزادی مل جائے گی جس کو کوئی بھی بگاڑ نہ سکے گا۔ اشفاق کو ہر وقت کام کی رٹ لگی ہوتی تھی اور مجھے کام سے بہت چڑ تھی، ان دنوں ہمارا رسالہ لنگڑی چال چل رہا تھا نہ جانے اس رسالے کے لئے مجھے کیا کیا لکھنا پڑ رہا تھا ایک دن اشفاق نے مجھ کہا کہ قدسیہ شہاب صاحب پر مضمون لکھ دو"(23)

مجھے شہاب صاحب کے بارے میں کچھ پتا نہ تھا پھر میں نے بڑی کوشش کر کے شہاب صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کی جو کچھ حاصل ہوا وہ من و عن کے ساتھ لکھ ڈالا کیوں کہ کسی کے بارے میں اندازے لگانا بہت مشکل کام تھا، میں 30 سال تک شہاب صاحب کو نہیں جانتی تھی میں صرف اس روشنی کو جانتی تھی جو شہاب صاحب کی وجہ سے میری زندگی میں آئی تھی، اور یہ مضمون بھی 30 سال پرانا ہے۔ بانو قدسیہ نے اس کتاب کے شروع میں کچھ شہاب کے گھریلو مسائل ان کی بہنوں اور ماں کا بھی ذکر ملتا ہے، ان کی ماں کی بھی خواہش تھی کہ شہاب کو بھی اشفاق کی طرح بیٹے کی طرح ایک بیٹا ہو، 28 سال گزرنے کے بعد مجھے اشفاق احمد کے تعارف میں مجھے کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آئی وہ ہی معلومات ملتی رہی جو 28 سال پہلے ملی تھیں، پھر مجھے تجسس ہوا کہ آخر ایسی کیا بات ہے جو میں شہاب صاحب کو نہیں جان سکیں "پھر میں نے مفتی صاحب اور عفت کی عینک سے شہاب صاحب کو دیکھنے لگی تو وہ شہاب نہیں تھے جو مجھے نظر آتے تھے۔ بانو قدسیہ شہاب صاحب کے بارے میں لکھتی ہیں کہ جتنے نفس پیدا ہوتے ہیں اتنے ہی راستے اللہ کی طرف سے نکلتے ہیں جس طرح ڈھونڈنے والوں کی قسمیں ہوتی ہیں اتنے ہی راستہ دکھانے والوں کے بھی ہوتے ہیں اور ایسے بھگت عمومی جمالی ہوتے ہیں، شہروں سے باہر اجاڑ میں رہتے ہیں وہ فطرت سے پیار کرتے ہیں ان کے ڈیروں پر کتے اور بلیاں ہوتی ہیں "(24

بانو قدسیہ آگے لکھتی ہیں "اللہ کے فقیروں میں وہ بھی چیدہ چیدہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں اللہ اپنے لئے پسند کرتا ہے ان کے ماتھے پر لاٹ اور ہاتھوں کے پوروں میں آتما میں آنند اور شانتی ہوتی ہے" (25)وہ بچپن میں سلام و درود بھیجتے ہیں ان کا وجود خوف اور حزن سے پاک ہوتا ہے کہ وہ ایک اونچے پہاڑ کی مانند ہوتے ہیں"۔ بانو قدسیہ لکھتی ہیں کہ شہاب بھائی کے وصال بعد میں نے ان کو خواب میں دیکھا کہ وہ ایک اونچے پہاڑ پر رہتے ہیں جہاں ان کا ایک خوبصورت گھر بھی ہے جیسے سوئیڈن اور ناروے میں ہوتے اندر کمرے میں لال سرخ لائیٹ جل رہی تھی وہاں ایک خوبصورت درخت بھی تھا جس کے نیچے شہاب بھائی بیٹھ کر کتاب

پڑھ رہے تھے اور اچانک میرا خواب ٹوٹ گیا تھا۔ خان زور سے بولے قدرت میں اوپر کیسے آوں، شہاب بھائی نے ایک رسی نیچے پھینکی اور اس رسے کے دو فٹ تک گرہیں لگی ہوئیں تھیں۔ اشفاق تم اسیر کے پیچھے رہنا تم میں سے اگر کوئی گر جائے گا تو اسیر اس کو سنبھال لے گا ہم پانچوں کانپتے ہوئے اوپر پہنچے ، شہاب بھائی کے گھر کی چاروں طرف لوہے کے نوکیل کانٹوں بھرے تھے جس سے پار کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا"۔(26)

حوالہ جات

1. 1حمیدہ اختر حسین رائے پوری، مشمولہ چہرے مہرے، کراچی، مکتبہ دانیال، 2023ص 5
2. حمیدہ اختر رائے پوری، مشمولہ چہرے مہرے، کراچی، مکتبہ دانیال، 2023ص 5
3. حمیدہ اختر رائے پوری، مشمولہ چہرے مہرے، کراچی، مکتبہ دانیال، 2023 ص 7
4. حمیدہ آختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر نیوس، مشمولہ چہرے مہرے، کراچی، مکتبہ دانیال2023 ص11
5. صالحہ عابد حسین ،جانے والوں کی یاد آتی ہے، دو باتیں ص 7
6. صالحہ عابد حسین، جانے والوں کی یاد آتی ہے ،ایک بڑاانسان ص 12
7. صالحہ عابد حسین ،جانے والوں کی یاد آتی ہے، چشم وچراغ حالی خواجہ سجاد حسین ص23
8. ایضا، ص 34
9. ایضا، امٹ یادیں، ص 45
10. ایضا، امٹ یادیں، ص 55
11. ایضا، ص 58
12. ایضا ،ص 61
13. ایضا، ص 63
14. ایضا، ص6
15. رضیہ سجاد ظہیر، زرد گلاب، لنگڑی ممانی، ص 68
16. ایضا، ص 68-69
17. ایضا، ص73
18. ایضا، ص 74-75
19. رضیہ سجاد ظہیر، زرد گلاب، ستوں، ص13
20. بانو قدسیہ، مرد ابریشم، قدرت اللہ شہاب، ص5
21. ایضا، ص 10
22. ایضا، ص 10-11
23. ایضا، ص11
24. ایضا، ص66
25. ایضا، ص 66-67
26. ایضا، ص 67-68